U46214 5-12-9

Title - SILK-E-GAUHAR ; MAJMUA RUBAIYAAT-O-QATAAT

Creator - Rafeeq Ahmad Siddique Maikash Badauni.

Publisher - Maktaba Mohd. Shamsur Rehman Khan (Aligarh).

Date - 1946.

Pages - 64

Subjects - Urdu Shayari - Rubaiyaat ; Urdu Shayari - Qataat.

سلکِ گوہر

میکشؔ بدایونی

مکتبۂ محمود شمس الرحمٰن خاں سرائے رحمٰن علی گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلکِ گوہر

یعنی

قواعد شعر و شاعری

اور

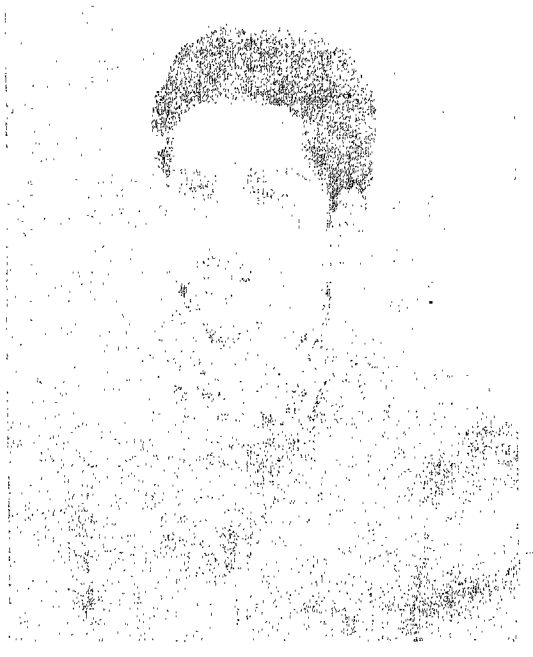
مجموعۂ رباعیات و قطعات

یکم جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

از
تراوشِ فکر
رفیق احمد صدیقی مسکش
بدایونی

تعداد پانچسو ۵۰۰
قیمت فی جلد ۱۲؍

شعر و ادب کی روح
کے نام



اک مصوّر پردۂ تصویر میں عکس [illegible]

[illegible] ہے تو آئینۂ عالم میں [illegible]

[illegible]

فہرست مضامین

پیش لفظ

بالکل حادثہ سمجھئے، اور ایک اچھوتی مثال کہ آدمی خود شاعر ہونے سے پہلے سیکڑوں شاگرد پیدا کرے۔ واقعہ یہی ہے کہ حضرت میکشؔ نے خود کوئی شعر کہنے سے پہلے بہت سے شاگرد اکٹھے کر لئے تھے جن کے اشعار پر آپ مستقلاً اصلاح دیا کرتے تھے۔ خود کبھی کسی سے اصلاح نہ لی اور بغیر کسی کی مدد یا سہارے کے کثرت سے شعر کہتے رہے۔ استادی موروثی شاعری خانہ زاد، طبع موزوں و مذاق سلیم گھریلو ماحول کا اثر جہاں کا بچہ بچہ "شعر بولتا ہے"۔ آج ملک کے نوجوان شعراء کی صف اول میں ہیں۔ آئندہ تابندہ سے تابندہ تر نظر آ رہا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

میکشؔ تخلص، رفیق احمد صدیقی نام ہے۔ تاریخ پیدائش کا علم والدین کو ہوگا اس وقت اکیس ۲۱ بائیس ۲۲ کے لگ بھگ معلوم ہوتے ہیں۔ وطن بدایوں ہے، عمر زیادہ تر علی گڑھ میں گذاری ہے۔ ویسے تو "اغوں بھی" فاعلاتن فعلن کے وزن پر کہا ہوگا۔ لیکن ہمیں ان کی شاعری

سنتے پانچ چھ سال ہی ہوئے ہیں۔ بالخصوص مجھے ان کی شاعری کے ہر دور سے پوری واقفیت رہی ہے۔ بحیثیت مجموعی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُپج۔ ندرت۔ بانکپن اور تلاش ان کے کلام کی خصوصیات ہیں مذاق پاکیزہ ہونے کے باعث شعر کبھی گرنے نہیں پاتا، انداز بیان ہمیشہ ستھرا اور دلآویز ہوتا ہے۔

شاعری اندرونی کیفیات کا عکس بھی ہوتی ہے اور اندرونی خلفشار کا نتیجہ بھی کم از کم حضرت بیکش کے معاملہ میں میرا یہ قول بالکل صحیح ہے۔ طبع موزوں اور مزاج شاعرانہ تھا ہی، بچپن ہی سے دنیا کے نشیب و فراز اور زندگی کے رومانی و غیر رومانی واقعات و حادثات پیش آتے رہے، اونچ نیچ سے گذرنے کے بعد جو مستقل مزاجی پیدا ہوتی ہے، وہ حاصل ہونے کے ساتھ فن شاعری کا مطالعہ نہایت گہری نظروں اور بڑی کاوش سے کیا۔ چنانچہ اس کم عمری میں بہت ہی کہنہ مشق شاعر بن گئے۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی عرصے میں "افق شاعری پر مہر درخشاں" معلوم ہونے لگیں گے۔

یہ کتاب مبتدی شعراء کی ہدایت کے لئے لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں عروض و معانی کی دقیق بحثیں نہ لائی جا سکتی تھیں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ قواعد شعر و شاعری پر اتنے سادہ اور واضح انداز میں اس قدر اختصار کے ساتھ ضروری واقفیت بہم پہونچا دینا حضرت میکش کا ہی کام تھا — میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اُن حضرات کے لئے ایک بیش بہا چیز ثابت ہوگی جو شعر کہنا چاہتے تو ہیں لیکن فنّی واقفیت نہ ہونے کے باعث مجبور رہے ہیں۔

آخر میں حضرت میکش کی کچھ رباعیات اور قطعات بھی شامل ہیں اہل نظر و صاحبانِ ذوق کو اس میں دلچسپی و وابستگی کا کافی سامان ملے گا۔

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے"

چاہتا تھا کہ جناب میکش صاحب کے کلام پر کچھ سرسری تبصرہ بھی کرتا چلوں۔ لیکن بخوف طوالت نیت بدل دی ہے۔ آپ کا کلام ہے بھی اس قدر کثیر کہ اس کے لئے علیحدہ عنوان کی ضرورت ہوگی۔ آپ کے کئی مجموعہ و متفرق نظمیں شائع ہو چکی ہیں — اور دیوان کی اشاعت بھی زیرِ غور ہے۔ یہ سب کا سب طبع زاد ہے اور ذاتی قابلیت و صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ آپ حضرات انشاء اللہ پڑھکر بہت محظوظ ہونگے۔ والسلام

اطہر حسن حیدری — ایم۔ اے (علیگ)

اُردو شاعری

پر

ایک نظر

اُردو شاعری پر بحث کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مختصراً یہ بیان کردیں کہ خود شعر و شاعری کیا چیز ہے اور اُس نے افراد یا اقوام کی زندگی پر مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں کیا اثر ڈالا ہے.....

...شعر کی تعریف ہر شخص نے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ میرے خیال میں سب سے بہتر تعریف یہ ہے کہ شعر وہ ہے جس سے انسان کے دل کو شگفتگی یا دلگیری (دوسرے الفاظ میں مسرت یا الم) حاصل ہو..... اکثر نے اس پر وزن اور قافیہ کی قید بڑھائی ہے۔ گویا اب شعر کی تعریف یہ ٹھہری کہ ایسا کلام با وزن و قافیہ جو عکس جذبات ہونے کے ساتھ ساتھ حسن زبان و بیان کا مجموعہ ہو۔

وزن و قافیہ کا ذکر آ گیا ہے اس لئے ان سے بھی گونہ واقفیت ضروری ہے۔ واضح رہے کہ شعر کا اندازہ جس سے اُسکے ارکان

کے ناقص یا درست ہونے کا علم ہوتا ہے وزن یا بحر کہلاتا ہے۔ جس طرح ہم کسی جنس کو تول کر اُس کی مقدار معلوم کرتے ہیں اسی طرح شعر کے وزن سے اُس کی صحت و عدم صحت کا اندازہ ہوتا ہے اب رہا قافیہ۔ سو ایسے ملتے جلتے الفاظ جو شعر کے دونوں ٹکڑوں (یعنی دونوں مصرعوں) کے یا دوسرے مصرعہ کے آخر میں آئیں قافیہ کہلاتے ہیں ...... قافیہ کے ساتھ اکثر ردیف کا نام بھی آتا ہے۔ ردیف وہ مکرر لفظ ہے جو قافیہ کے بعد آئے مثلاً اس شعر میں ؎

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

بر اور نظر کو قافیہ اور نہیں آتی کو ردیف کہیں گے ......

شعر کی تاثیر کی نسبت زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک کھلی

نوٹ :۔ اس مضمون میں فنی مباحث اور اخلاقی مسائل سے قصداً پرہیز کیا گیا ہے کیونکہ اس کا مقصد محض مبتدی شعراء کی رہنمائی ہے۔ مضمون میں آب حیات۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ مراۃ الشعر۔ گل رعنا۔ شعر الہند۔ تاریخ ادب۔ چہار مقالہ وغیرہ سے کئی جگہ استفادہ کیا ہے ......

میکش بدایونی

ہوئی بات ہے کہ فطرۃً انسان کی طبیعت پر جس قدر کلام موزوں اثر کرتا ہے ناموزوں اثر نہیں کرتا۔ ایک بات کو نثر میں کہئے لطف نہ دے گی لیکن اگر اُسی بات کو لفظوں کے لوٹ پھیر سے وزن وقافیہ کی قید کے ساتھ کہہ دیجئے الفاظ کی موسیقیت اور کلام کی تاثیر دونی ہو جائیگی۔

لیکن صرف موزوں ہونا ہی کافی نہیں خیالات کی خوبی زبان کی صفائی۔ ادائے خیال کا حُسن یہ سب چیزیں جب مل جاتی ہیں شعر میں سحر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

مصنوعی شاعری کا ذکر نہیں حقیقی شاعری میں درحقیقت ایسا جادو ہوتا ہے کہ سُننے والے بیخود ہو جاتے ہیں۔ میں یہاں صرف دُو مثالوں پر اکتفا کروں گا جو میرے مطلب کو واضح کرینگی ایک عربی اور دوسری فارسی شاعری کی۔ عرب میں جس قدر شاعر ہوئے ہیں شاید ہی دُنیا کی کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اور دراصل اُنکی شاعری میں وہ سادگی اور زور ہے کہ بیان سے باہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری قبیلوں میں جنگ و صلح کرانے کا ذریعہ بن جاتی تھی۔ وہیں کے ایک اعرابی کا مشہور قصّہ ہے کہ اُس کے

کئی بیٹیاں تھیں اور افلاس کی وجہ سے اُن کو کوئی بَر نصیب نہ ہوتا تھا اتفاق سے عرب کا نامور شاعر اعشیٰ اُدھر سے گذرا اعرابی نے عرب کے دستور کے مطابق بڑی آؤ بھگت کی دورانِ گفتگو میں اعشیٰ نے لڑکیوں کی شادی نہ ہونے کی وجہ پوچھی اعرابی نے اپنے افلاس کی مجبوری ظاہر کی۔ اعشیٰ نے کہا کہ تم مطمئن رہو۔ اس کا بندوبست ہو جائیگا۔ چنانچہ دوسرے دن ہی اُس نے چند شعر اُس خاندان کی تعریف میں موزوں کئے اور قوم کو جا کر سنائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں ملک کے ممتاز جوانوں نے اُن لڑکیوں کی نسبت پیغام بھیجے اور سب کی شادیاں اونچے گھرانوں میں ہو گئیں ......

دوسرا واقعہ خاندان سامانی کے بادشاہ نصر بن احمد سے متعلق ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ معہ امرا و وزرا بخارا سے ہرات گیا۔ وہاں کے باغ و بہار کو دیکھکر ایسا گرویدہ ہوا کہ چار برس گذر گئے وطن کا نام نہ لیا۔ آخر ارکان دولت اکتا گئے۔ مگر بادشاہ سے عرض کرے یہ کس کی طاقت۔ آخر سب نے دربار کے شاعر رودکی سے التجا کی۔ رودکی نے بخارا کی تعریف میں ایک قصیدہ تصنیف کیا اور بادشاہ کے حضور میں جا کر خوش الحانی سے سنایا۔ قصیدہ کا آغاز یوں تھا۔

لوئے جوسے مولیاں آیئیمی   یا دِ یاراں مہرباں آیدہمی

قصیدہ کا سُننا تھا کہ بادشاہ بے اختیار ہو گیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً وطن کا رُخ کر دیا .... عام شاعری کے متعلق اس مختصر تمہید کے بعد ہم اصل موضوع یعنی اُردو شاعری کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور آسانی کے خیال سے اُس کو تین۳ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(الف) اُردو شاعری کی تاریخ۔ (ب) اُردو شاعری کے محاسن اور معائب۔ (۳) اُردو شاعری کا مستقبل۔

الف ـــ اُردو شاعری کی تاریخ۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے اس کو اپنا وطن بنایا اور اُس کے نفع اور نقصان کو اپنا نفع اور نقصان سمجھا اُس وقت میل جول کی خواہشوں اور لین دین کی ضرورتوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو تبادلہ خیالات پر مجبور کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ گئی۔ جو ایک طرف فارسی کی شیرینی ـــ دوسری طرف ہندی کی دلآویزی کا عطر مجموعہ تھی یا یوں سمجھئے کہ ہندو مسلم اتحاد کا کامل نمونہ تھی۔ یہی زبان جو شروع میں ہندی۔ ہندوستانی۔ دہلوی۔ دکنی۔ گجراتی

ریختہ وغیرہ کے ناموں سے موسوم تھی بعد کو اُردو کہلائی شمس العلماء آزاد کا خیال ہے کہ یہ برج بھاشا سے نکلی ہے۔ مگر جدید تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مغربی ہندی کی شاخ ہے جو نواح دہلی اور میرٹھ کی زبان تھی۔ اور جو سورسینی پراکرت سے نکلی ہے۔

امیر خسرو دہلوی جن کا سن وفات ۷۲۵ھ یا ۱۳۲۵ء ہے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس زبان میں گیت اور پہیلیاں وغیرہ تصنیف کیں۔ قیاس چاہتا ہے امیر خسرو سے پیشتر بھی اس زبان کا وجود ہوگا۔ مگر کوئی تحریری شہادت ہمیں اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ اُس زبان کے نمونہ کے طور پر ہم اس وقت اُن کی ایک پہیلی پر اکتفا کرتے ہیں

چار مہینے بہت چلے اور آٹھ مہینے تھوڑی — امیر خسرو یہ کہیں بتاؤ پہیلی موری

سکندر لودھی کے زمانہ میں جبکہ کایستھوں نے سلطنت کی زبان یعنی فارسی سیکھی اور بڑے بڑے عہدے حاصل کئے ہندوؤں کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ گئے اور اسی طرح مسلمانوں کی زبان پر دیسی زبان نے قابو پالیا اور باہمی میل جول سے روانی پیدا ہوگئی۔ مغلوں کے شروع عہد میں شمالی ہند میں البتہ اس زبان کا زیادہ چرچا سننے میں نہیں آتا۔ لیکن دکن اور گجرات کے شاہی دربار میں

اور صوفیوں کی حال وقال کی مجلسوں میں یہی زبان گرمیٔ محفل کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ لوگ مرکزی سلطنت سے دور ہونے کے سبب سے فارسی کے اثر سے آزاد اور دیسی پیداوار (اُردو) کی ترقی میں سرگرم تھے۔ چنانچہ اُردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان دکن ہی کا ایک بادشاہ محمد قلی قطب شاہ (بادشاہ گولکنڈہ) تھا جو اکبر اعظم کا ہم عصر تھا۔ یہ صحیح ہے اُس کی زبان (دکنی اُردو) آجکل آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی مگر اُس کو بہر حال اُردو ہی کہنا پڑے گا۔ اُمیر خسرو کا متفرق کلام چھوڑ کر محمد قلی مذکور کے اشعار اُردو شاعری کے قدیم ترین نمونہ ہیں جو ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں۔ واضح رہے کہ آزاد نے ولی دکنی کو اُردو کا پہلا شاعر مانا ہے۔ مگر جدید تحقیقات نے (جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا) اس امر کو آفتاب کی طرح روشن کر دیا ہے کہ ولی سے مدتوں پہلے اُردو میں دیوان مرتب ہو چکے تھے۔

ہمیں نثر اُردو سے اس وقت بحث منظور نہیں مگر چلتے چلتے اتنا کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے بیان کے مطابق اُردو نثر کی پہلی کتاب وہ مجلس ہے جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی۔ مگر موجودہ جستجو کی بدولت تاریخ اُردو کے پرانے نظریئے سب باطل ہو گئے۔

چنانچہ یہ امر بایہ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ دکن کے ایک بزرگ شیخ عین الدین نے دکنی اُردو میں تصوف کے جو رسالے آٹھویں صدی ہجری میں ترتیب دیئے وہ نثر اُردو بلکہ اُردو کی سب سے قدیم تصانیف ہیں۔ غرضکہ محمد قلی مذکور کے بعد بھی کئی شعراء ہوئے جو بیجاپور اور گول کنڈہ میں دادِ سخن ورمی دیتے رہے۔ یہانتک کہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن کو فتح کرکے سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا۔ گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد اورنگ آباد میں اکثر لوگوں نے پناہ لی۔ اورنگ زیب کے قیام کی وجہ سے دہلی و آگرہ کے بیشمار امراء و علماء وہاں آئے اور اورنگ آباد اُردو شاعری کا مرکز بنا۔ بہت سے شعراء وہاں جمع ہو گئے ولی کا ستارہ بھی وہیں چمکا۔ اورنگ زیب کی اولاد میں عرصہ تک خانہ جنگیاں رہیں آخر محمد شاہ کے زمانہ میں امن نصیب ہوا اور اہل کمال سمٹ کر دہلی آ گئے۔ اسی زمانہ میں ولی بھی دکن سے دہلی آئے اور قبول عام حاصل کیا۔ الغرض اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز دکن سے ہوا۔ اُس کے بعد دہلی میں ریختہ سے اُردوئے معلیٰ کا خطاب پایا اور رفتہ رفتہ تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس جگہ بے محل نہ ہوگا اگر ہم گل رعنا کے مصنف کے قرار دادہ اُردو شاعری

کے مختلف دور مبتدی شعراء کی سہولت کے لئے بیان کر دیں۔
ان دوروں کی ترتیب زیادہ تر زبان کی اصلاحات کی بنا پر قایم کی گئی ہے۔ اور ہر دور کے صرف مشہور یا صاحب طرز شعراء کا نام دیدیا گیا ہے۔ وہ دور یا طبقات یہ ہیں۔ الف متقدمین (۱) شعراء بیجاپور و گل کنڈہ۔ مولانا نصرتی وغیرہ۔ (۲) شعراء اورنگ آباد ولی وغیرہ (۳) شعرائے دہلی۔ آبرو وغیرہ۔
(ب) متوسطین۔ (۱) میر تقی اور مرزا سودا۔ (۲) مصحفی و میر حسن۔
(۳) ذوق و غالب و مومن۔
(ج)۔ متاخرین۔ (۱) ناسخ و آتش (۲) امیر و داغ۔ (۳) حالی و اکبر۔
اوپر کے بیان سے یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ اردو زبان کی ساخت جس قدر ہندی کی مرہون احسان ہے اتنی عربی و فارسی کی نہیں۔ اور بقول آزاد یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اردو کا پتلا ہندوستانی زبانوں کی مٹی سے بنا ہے۔ باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام دیا ہے اس کو یوں سمجھئے کہ کلمہ کی تین ۳ قسمیں ہوتی ہیں۔ اسم۔ فعل۔ حرف اب اردو زبان کے فعل اور حرف دیکھ جائیے۔ مجھے یقین ہے کہ ۸۰ فی صدی اردو افعال اور حروف ہندی الاصل ہونگے۔ اسم البتہ

فارسی و عربی کے ملیں گے جو بکثرت اُردو میں رائج ہونگے اور جن کو ہر عالم و جاہل بولتا اور سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر چند جملے پیش کرتا ہوں۔ اپنے نہیں۔ بلکہ مرزا غالبؔ کے۔ فرماتے ہیں۔ پیر و مرشد ۱۲ بجے تھے۔ میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقّہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آ کر خط دیا۔ میں نے کھولا پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا کُرتہ گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا۔ میرا نقصان ہوتا۔ غور کیجئے ان چند جملوں میں ۴۰ سے اوپر الفاظ ہیں جن میں صرف مرشد۔ حقّہ۔ آدمی۔ خط۔ حضرت۔ نقصان۔ عربی اور پیر اور گریبان فارسی ہیں۔ باقی تمام لفظ ہندی الاصل ہیں۔

اس سے بھی قطع نظر۔ کیا کوئی انصاف پسند۔ سری لال۔ دیاشنکر نسیم۔ رتن ناتھ سرشار۔ برج نرائن چکبست۔ جگت موہن رواںؔ۔ جیسے زبردست ادیبوں اور شاعروں کی خدمات سے انکار کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر میرا اعتقاد ہے کہ اُردو پر جس قدر مسلمانوں کا دعویٰ ہے۔ اسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ ہندوؤں کا حق ہے۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ اُردو خصوصاً اُردو شاعری کے خیالات بیشتر فارسی سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح اُس کے اصول و قواعد صرف و نحو

عروض وغیرہ بھی فارسی کی نقل ہیں جس نے خود عربی سے یہ چیزیں مستعار لی ہیں۔ بہر حال اس کی بابتہ میں کسی دوسری جگہ وضاحت سے کام لوں گا۔ اس جگہ ایک سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس بحث میں اکثر اُٹھایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اوّل اُردو نظم وجود میں آئی یا نثر میرا جواب یہ ہے کہ نثر۔ کیونکہ عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ پہلے بچہ باتیں کرنی سیکھے گا۔ ہاں وہ نثر بول چال تک محدود رہی۔ تصنیفی حیثیت سے پہلے نظم ہی نمبر ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ عرصہ تک اُردو نثر میں تصنیف کرنا کم علمی کی علامت سمجھا جاتا تھا ہندو ہندی میں اور مسلمان فارسی ہی میں لکھنا پسند کرتے تھے۔ رہی نظم وہ جوشِ طبیعت کا اثر تھا یا درباری مذاق کا۔ اس لئے پہلے اُبل پڑی۔

(ب)۔ اُردو شاعری کے محاسن اور معائب ۔۔ اب ہم مضمون کے دوسرے جزو کو لیتے ہیں یعنی اُردو شاعری کا ڈھانچہ کیونکر تیار ہوا۔ اوپر آپ نے سُنا کہ اُردو شاعری خیالات میں زیادہ تر فارسی کی اور اصول و قواعد فن میں عربی کی پیرو ہے۔ یہ اجمال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے سنئے۔ شاعری کی بنیاد دو چیزوں

پر ہے ۔ محاکات اور تخییل ۔ محاکات سے یہ مراد ہے کہ شاعر کسی واقعہ کو دیکھے اور جو اثر اُس پر ہوا ہے وہی اپنے الفاظ سے دوسروں پر طاری کر دے گویا سننے والے کو ایسا معلوم ہو کہ واقعہ میرے سامنے ہو رہا ہے۔

تخییل کی تعریف یہ ہے کہ شاعر اپنے قوت خیال کے زور سے اصل کو نقل یا نقل کو اصل کر دکھائے ۔ اور اس سے سننے والے پر کوئی اچھا اثر ڈالنا مقصود ہو ۔ مگر یاد رہے کہ اگر محاکات حد اعتدال سے بڑھ جائے گی تو محض واقعہ نگاری ہو کر رہجائیگی اور شاعرانہ حسن جاتا رہیگا ۔ اسی طرح اگر تخییل اپنے حدود سے متجاوز ہو گی تو دروغ بے لذت یا مبالغہ بے لطف ہو جائیگی ۔

اس وقت ہم محاکات و تخییل کی دو مثالوں پر اکتفا کریں گے ۔

محاکات کی مثال سنیئے ۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل | برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

دو بالا کئے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے | بیرے بھادوں کے جو آتے ہیں بھر گنگا جل

بجلی دو چار قدم چلکے پلٹ جاتی ہے یوں | وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل

شب دیجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں | لیلی محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

محسن کاکوروی کے ان اشعار میں اگرچہ قوت خیال سے بھی کافی کام لیا گیا مگر اصل میں اس کو محاکات کی مثال کہنا چاہیئے ۔ اس سے بہتر واقعہ کی تصویر خیال میں نہیں آسکتی ۔ بلکہ اس سین کو دیکھنے والا بھی شاید سننے والے سے زیادہ لطف نہ اٹھا سکے ان شعروں میں مقامی ملکی رنگ ضرور ہے ۔ لیکن عام اردو شاعری میں ایسا نہیں جتنی کہ انداز بیان اس میں بھی فارسی سے ماخوذ ہے۔ اب تخییل کی مثال ملاحظہ ہو ۔ آپ کسی جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں۔ کسی ٹوٹی پھوٹی قبر کی ہڈی یا مٹی آپ کے پاؤں سے مس ہوتی ہے مگر آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی ۔ مگر ایک شاعر جو بڑا احساس دل لیکر قدرت سے آیا ہے اور جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ سرگرم گفتگو ہوتا ہے اس واقعہ سے تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو وہ ہڈیاں بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔ ذرا سنیئے وہ اُن کی گفتگو کیونکر اپنے الفاظ میں دہرا رہا ہے ۔

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا ۔۔۔ یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر ۔۔۔ میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

ان مثالوں سے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اردو شاعروں کے

سامنے جو نمونہ تھا وہ فارسی شاعری کا نمونہ تھا۔ اُنھوں نے آنکھ کھولی تو اُسی کو دیکھا اور اُسی کی نقل کی یہاں تک کہ محاکات کے اسلوب۔ تخییل کے انداز۔ تشبیہات اور استعارات اصول وقواعد فن سب فارسی ہی سے عاریت لئے۔ اس سے فائدہ بھی ہوا نقصان بھی یعنی فارسی شاعری کی لطافت اور نزاکت کے ساتھ اُس کا مبالغہ اور خیالی باتیں بھی اُردو میں آگئیں۔ دور کیوں جائیے۔ ابرو باراں کا جو مقامی سین اوپر دکھایا ہے اُس میں اندھیری رات کو تشبیہ دی تو کس سے عرب کی ایک محبوبہ (لیلی) سے۔ ظاہر ہے کہ لیلی اور محمل کے مفہوم قطعاً غیر ملکی ہیں۔ اور وہ فارسی میں بھی عربی سے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ اقسام شاعری یا اصناف نظم بھی اُردو میں تمامتر فارسی کا صدقہ ہیں۔ اسی جگہ بے محل نہ ہوگا اگر ہم اپنے عزیز نومشق شعراء کی سہولت کے لئے یہ بتا دیں کہ اُردو شاعری کی اقسام کے اور کیا ہیں شاعری یا نظم کی قسمیں اُردو میں دس قرار دی گئی ہیں اور یہ سب فارسی کی تقلید ہے۔ اگرچہ سائنٹیفک طریقہ سے یہ قسمیں موضوع شعر کی بنا پر ہونی چاہیئے تھیں۔ مثلاً مدح۔ عشقیہ۔ رزمیہ۔ اخلاقی۔ صوفیانہ وغیرہ مگر عام طور پر جو تقسیم کی جاتی ہے وہ محض سطحی اصول پر

مبنی ہے۔ غرض یوں سمجھیئے کہ ظاہری شکل کے اعتبار سے نظم کی وئی قسمیں ہیں۔ (۱) غزل نظم کی اس قسم کو کہتے ہیں جس میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخری مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ غزل میں عموماً عشقیہ مضامین ہوتے ہیں۔ صوفیانہ یا اخلاقی مطالب بھی کبھی بیان کئے جاتے ہیں۔ غزل کے اشعار عموماً کم از کم پانچ زیادہ سے زیادہ ۱۷ یا ۱۹ ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کو مطلع اور آخر شعر کو جس میں شاعر کا تخلص ہو مقطع کہتے ہیں مثال کے طور پر مرزا غالب کی وہی غزل لیجئے جس کا مطلع آپنے اوپر سنا تھا۔

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

اس غزل کا آخری شعر یعنی مقطع یہ ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۲) قصیدہ میں بھی پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخر مصرعے ایک ہی قافیہ پر ہوتے ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ قصیدہ میں کسی کی تعریف۔ ہجو یا اخلاقی نصیحت ہوتی ہے اور اس میں اشعار کم از کم ۱۹ ہوتے ہیں زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ عام طور پر قصیدہ کے چار حصے ہوتے ہیں۔ تمہید۔ گریز یعنی اصل مطلب

کی طرف رجوع ۔ مدح ۔ اور دعا ۔ صورۃً یہ غزل ہی سے مشابہ ہے ۔ (۳) مثنوی ۔ وہ نظم جس کے ہر شعر میں جداگانہ قافیہ ہو ۔ یہ کسی داستان یا تاریخی واقعے کے لئے زیادہ مناسب ہے ۔ اور اس میں اشعار کی تعداد ہزاروں تک پہونچ سکتی ہے ۔ مثالاً دو تین شعر منشی دیا شنکر نسیم کی مشہور مثنوی گلزار نسیم کے پیش کرتا ہوں ۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ‏ ‏ ‏ ‏ ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر ‏ ‏ ‏ ‏ حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں سے یہ حرف زن ہے ‏ ‏ ‏ ‏ یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

(۴) قطعہ ۔ دو یا چند شعر جن کے آخر مصرعے ہم قافیہ ہوں ۔ قطعہ کا مضمون مسلسل ہوتا ہے ۔ اشعار کم از کم دو ہوتے ہیں ۔ مثلاً ۔

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہوئے کرتے ہیں سلام ‏ ‏ ‏ ‏ اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

(۵) رباعی ۔ صرف دو شعر والی نظم جس کا پہلا ۔ دوسرا ۔ چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوں ۔ اس کا مضمون مسلسل اور وزن مخصوص ہوتا ہے ۔ مثلاً

اردو میں جو سب شریک ہو سکتے نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ اس ملک کے کام ٹھیک ہو سکتے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرؤ القیس بنیں ‏ ‏ ‏ ‏ پنڈت جی والمیک ہو سکتے نہیں

(۶) **فرد** - کوئی تنہا شعر - خواہ اُس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں یا نہ ہوں - جیسے -

موت کا ایک دن معین ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

(۷) **مستزاد** - وہ نظم جس کے ہر مصرعہ کے آخر میں ایک ٹکڑا بڑھا دیا جائے جو مضمون سے مناسبت رکھتا ہو - جیسے -

ہر کج وطن غرقۂ اندوہ و محن والے　　　اے والے وطن والے

ہر مورد بیداد خزاں صحن چمن والے　　　اے والے وطن والے

(۸) **مسمط** - نظم کی وہ قسم ہے جس میں شاعر اپنے یا دوسرے کے دو مصرعوں پر چند مصرعے لگائے - اس کی کئی قسمیں ہیں جن میں مخمس یا خمسہ (یعنی ۵ مصرعوں والی) اور مسدس (۶ مصرعوں والی نظم) زیادہ مشہور ہیں - مثالیں بخوف طوالت ترک کرتا ہوں -

(۹) **ترکیب بند** - وہ نظم جس میں کئی بند ہوں - ہر بند میں کم از کم ۵ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ شعر ہوتے ہیں - ہر بند کے آخر میں ایک شعر (بیت) لاتے ہیں جو مضمون میں اوپر کے اشعار سے ملتا ہو مگر قافیہ میں مختلف ہوتا ہے -

(۱۰) **ترجیع بند** - یہ ترکیب بند سے مشابہ ہوتا ہے - صرف اتنا

فرق ہے کہ اس میں ہر بند کے آخر میں ایک ہی شعر بار بار لاتے ہیں۔
یہ تمام اقسام شعر جو اوپر بیان ہوئیں بجنسہ فارسی سے اُردو میں لیگئی ہیں۔ یہی حال اصول فصاحت و بلاغت کا ہے جو فارسی کی بالکل نقل ہے۔ مضمون طویل ہو جائے گا ورنہ ہم ان اصول پر مفصل بحث کرتے۔ تاہم اجمالی بیان کئے دیتے ہیں۔ یاد رکھئے فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو ثقیل اور اجنبی نہ معلوم ہوں اور گرامر اور لغت کے خلاف نہ ہوں۔ بلاغت کا مفہوم یہ ہے کہ کلام موقع اور حال کے مطابق ہو۔ کلام میں بلاغت پیدا کرنا تین علوم پر موقوف ہے۔ معانی۔ بیان۔ بدیع۔ علم معانی کا تعلق اُن قاعدوں سے ہے جن سے کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ بیان تشبیہ و استعارہ وغیرہ سے متعلق ہے۔ اور بدیع اُن قاعدوں (یا صفتوں) سے علاقہ رکھتا ہے جن سے کلام میں حسن پیدا ہو جائے۔ معانی کا گرامر سے بہت قریبی رشتہ ہے۔ اس لئے بخوف طوالت اس کی بحث نظر انداز کرتا ہوں۔ تشبیہ و استعارہ کا فرق سن لیجئے۔ کان پڑی بات کبھی نہ کبھی کام آئے گی۔ تشبیہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز کو

کسی مناسبت کی وجہ سے دوسری چیز سے مثال دی جائے۔ جیسے

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اس شعر میں سینہ کو مشرق سے اور گریباں کے چاک کو صبحِ قیامت کے طلوع ہونے سے تشبیہ دی ہے۔ استعارہ بھی تشبیہ کی طرح ہے فرق یہ ہے کہ استعارہ میں اُس چیز کا ذکر نہیں کرتے جس کو تمثیل دی جا رہی ہے۔ مثلاً مرزا دبیر ایک مرثیہ میں حضرت عباسؓ کی میدانِ جنگ میں آمد یوں بیان کرتے ہیں ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

اس شعر میں حضرت عباسؓ کو بہادری کی بنا پر شیر کہا ہے مگر اُس کا نام نہیں لیا اس لئے استعارہ ہوا۔ تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ بدیع یعنی صفتوں کا شاعری سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ اس لئے چند خاص خاص صفتیں جو اردو شعراء نے زیادہ استعمال کی ہیں یاد رکھنی چاہئیں۔ واضح رہے کہ صفتیں دو قسم کی ہوتی ہیں لفظی اور معنوی صنائع لفظی میں تجنیس۔ قلب۔ اشتقاق زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ صفت تجنیس یہ ہے کہ دو یا زیادہ لفظ باہم ملتے ہوئے استعمال کئے جائیں۔ مثلاً دور اور دُر۔ یا رحمت اور زحمت وغیرہ صفت قلب

وہ صفت ہے جس میں حروف لوٹ دیئے گئے ہوں۔ مثلاً۔ بارش کو قلب کرنے سے شراب بن جاتی ہے۔ صفت اشتقاق میں دو یا زیادہ الفاظ ایک ہی مادہ کے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

معنوی صفتوں میں صفت تضاد۔ مراعاۃ النظیر۔ ایہام۔ لف و نشر مبالغہ حسن التعلیل۔ تلمیح زیادہ اہم۔ دلچسپ اور کثیر الاستعمال ہیں۔ اسلئے ان میں سے ہر ایک کی بابتہ چند سطریں شاید دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوں۔

صفت تضاد یہ ہے کہ دو ایسے لفظ استعمال کئے جائیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ مثلاً

ع۔ بیٹھتے ہی مرے محفل سے وہ اُٹھ جاتے ہیں

بیٹھنا اور اُٹھنا دونوں باہم متضاد اور ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

مراعاۃ النظیر۔ ایک سلسلہ کے باہم ملتے ہوئے الفاظ استعمال کرنا مثلاً

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے

ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

دیکھئے۔ گلشن۔ صبا۔ بلبل۔ رنگ۔ پھول۔ بو۔ سب

سب کس قدر متناسب اور ملتے ہوئے الفاظ ہیں۔ ایہام سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس کے دو معنی ہوں۔ اس کی نہایت پُر لطف مثال ایک مصرعہ ہے جو عرصہ ہوا کسی شاعر نے ایک گورنر جنرل کی نسبت لکھا تھا۔ جس نے ہندوستانیوں کو جھوٹا کہا تھا۔ مصرعہ یہ ہے ؎

ع جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ

مصرعہ میں بظاہر ناراض ہونے کی کوئی بات نہ تھی مگر شاعر نے دراصل دوسرے معنی مراد لئے تھے کیونکہ محاورہ میں جھوٹوں کے بادشاہ سے بڑا دروغگو مراد ہوتا ہے۔ لف ونشر وہ صنعت ہے جس میں چند چیزیں ایک جملہ یا مصرعہ میں بیان کی جائیں۔ اور دوسرے جملہ یا مصرعہ میں اُن کے مقابل چند اور چیزیں مذکور ہوں۔ مثلاً

آپ کے مہر و قہر کا کیا ذکر وہ ہے عیش جناں۔ یہ نار جحیم

مہر کے مقابل عیش جناں اور قہر کے مقابل نار جحیم استعمال کیا گیا ہے۔ مبالغہ۔ کسی امر کو حد سے بڑھا کر یا گھٹا کر بیان کرنا۔ واضح ہے کہ مبالغہ اگر عقلاً اور عادۃً دونوں طرح ممکن ہو تو تبلیغ کہلاتا ہے۔ مثلاً گرمی کے بیان میں میر انیس کا یہ شعر ؎

شیر اُٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے   آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

اور اگر عقلاً ممکن ہو مگر عادۃً ممکن نہ ہو تو اُس کو اغراق کہیں گے۔ جیسے

ذرا بھی میں دشمن سے جو دوا پوچھ رہا ہوں   اللہ کرے دردِ محبت کا بُرا ہو

لیکن اگر عقلاً اور عادۃً ہر طرح ناممکن ہو تو وہ غلو کہلائے گا۔ جیسے گرمی کے متعلق انیسؔ کا دوسرا شعر ؎

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں   پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

حسنِ التعلیل یہ ہے کہ کسی بات کی وجہ کچھ اور ہو اور شاعر کچھ اور بیان کرے۔ مثلاً

کس کی ہے زیرِ زمیں لحد نمناک ہنوز   جابجا سوت ہیں پانی کے تہِ خاک ہنوز

زمین میں پانی کے سوت طبعی اسباب کا نتیجہ ہیں مگر شاعر کا خیال ہے کہ کوئی رونے والا زمین میں دفن ہوا ہے جس کے گریہ کے اثر سے ہر جگہ پانی نکلتا ہے۔

تلمیح کسی قصہ طلب امر کی طرف اشارہ کرنے کو کہتے ہیں جیسے

ابتک یہ صدا آتی ہے موسیٰؑ کی لحد سے   آواز سنی ہے تری صورت نہیں دیکھی

اس میں حضرت موسیٰؑ اور طور کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس تمام تفصیل سے نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ اردو نے ہندی کی آغوش

میں نشو و نما پائی مگر اُس کی تعلیم فارسی کے دبستان میں ہوئی۔ خصوصاً اُردو شاعری تو اپنے خیالات۔ انداز بیان۔ دلکش تراکیب تشبیہات۔ استعارات۔ صنائع و بدائع۔ حتیٰ کہ اقسام نظم اور اوزان میں بھی فارسی کی پیرو رہی اس پیروی سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ یعنی ایک طرف فارسی کی بدولت نازک خیالات۔ صوفیانہ مضامین۔ دلکش اور مختصر ترکیبیں اُردو شاعری کے حصے میں آئیں۔ دوسری طرف خیالی اور مبالغہ آمیز مضامین کی اس قدر بہتات ہوئی کہ اُردو شاعری مفید اور کار آمد مباحث کے قابل نہ رہی اب کوئی سنجیدہ اور معقول بات بھی کہنی چاہیں تو تشبیہات و استعارات کی رنگینی اور صنائع اور بدائع کی پابندی زبان روکتی ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اُردو شاعری میں اعلیٰ خیالات نہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو عشق۔ مدح۔ اخلاق۔ تصوف مرثیہ پر ہماری زبان میں اس قدر متنوع اور نازک خیالات ہیں کہ ہماری شاعری کو دوسری قوموں کی شاعری کے سامنے شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہیں۔ البتہ شاعری کا وہ عنصر جس کے اندر حقیقت و صداقت کی گرج اور

قومیت و وطنیت کی بجلیاں کارفرما ہوں ہمارے یہاں نہ ہونے کی برابر ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اہل یونان نے مدتوں اپنی قوم کے جذبات کو شعر کی حرارت کی مدد سے افسردہ ہونے سے بچایا۔ عربوں نے اپنی شاعری سے اکثر جنگجو قبائل کو شیر و شکر کر دیا اور پست ہمتوں کو عالی حوصلگی کے بام پر پہونچا دیا۔ یہ صفت ہماری شاعری میں بیشک نہیں۔ اس لئے کہ اردو نے فارسی کی خیال آفرینی کو ہمیشہ اپنا مطمح نظر سمجھا۔ اور خیال آفرینی اور حقیقت میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے تاثیر پیدا نہ ہو سکی۔ فارسی کی پیروی میں ہمارے شعراء نے یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دی کہ خود اردو کے وطن شاعری کی ہمسایہ بھاشا اپنے اندر کس قدر دلکشی اور تاثیر رکھتی ہے۔ اگر بھاشا کی شاعری کی تلمیحات تشبیہات اور اسلوب بیان کو اختیار کیا جاتا تو ایک طرف ہماری زبان واقفیت۔ اثر اور سادگی کی نعمت سے مالا مال ہو جاتی اور دوسری طرف ہمیں اپنے ہمسایہ اور ہموطن بھائیوں کی تہذیب و تمدن سے واقف ہونے کا موقع ملتا۔

میں بذاتِ خود بھاشا سے نابلد ہوں۔ مگر بھاشا شاعری کے ترجموں کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ زور۔ صداقت۔ سادگی جو عمدہ شعر کے زیور ہیں

سب بڑی حد تک ہندی کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ طریقہ برتا جاتا تو اُس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ہماری زبان میں خیالات کا تنوع اور ادائے خیال کے طریقوں کی بہتات ہو جاتی۔ مجنوں لیلیٰ و مجنوں اور شیریں فرہاد کے تذکرہ پر اعتراض نہیں لیکن اگر ہمارے شعراء نل دمن اور ہیر رانجھا کے لئے بھی جگہ نکال سکتے تو بہتر تھا۔

(ج) اُردو شاعری کا مستقبل — اب آخر میں مجھے اُردو کے مستقبل کی نسبت کچھ کہنا باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حالات اُردو کے حق میں اُمید افزا ہیں۔

انفرادی کوششوں سے قطع نظر ملک میں چند ادارے اور انجمنیں نہایت استقلال اور تندہی سے اُردو کی ترقی میں سرگرم ہیں۔ اعلیٰحضرت تاجدار دکن کی سرپرستی میں حیدرآباد اور اورنگ آباد جو کچھ کر رہے ہیں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دار المصنفین اعظم گڑھ اور پنجاب کی دارالاشاعت اور دوسری انجمنیں بھی اپنے دائرہ عمل میں معروف کار ہیں۔ سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے صوبہ کی حکومت نے ہندوستانی اکاڈیمی قایم کر کے ملک کی ایک بڑی ضرورت کو رفع کر دیا ہے — ان حالات کے ماتحت یقین ہے کہ ہماری زبان جو اب خدا کے فضل سے

علمی زبان کہلانے کی مستحق ہو گئی ہے روز افزوں ترقی کرے گی ۔ خود
شاعری میں اب پہلے کی نسبت مطلع نہایت درخشاں نظر آتا ہے ۔ جدید
خیالات کے اثر سے آزاد ۔ حالی ۔ اکبر ۔ اقبال نے اردو شاعری
کی اصلاح کا جو درخت بویا تھا اب وہ بارور ہو چلا ہے ۔ اور ملک
میں مفید اور بلند ادبیات کی قدر بڑھتی جا رہی ہے ۔ ان بزرگوں
کے نقش قدم پر چل کر سینکڑوں نوجوان قومی ۔ وطنی اور نیچرل شاعری
کی دشوار گذار راہیں طے کر رہے ہیں ۔ اور وہ وقت قریب آ رہا ہے
جب ہماری زبان دنیا کے بڑے سے بڑے ادب کا مقابلہ کر سکے گی ۔
غزل اور عشقیہ شاعری میں بھی چند بالغ نظر اصحاب نے اصلاح کا
کام کیا ہے گندہ اور پست خیالات کی بجائے ۔ اب تغزل کا دفتر
حقیقت تصوف ۔ اخلاق اور فلسفہ کی دولت سے مالا مال نظر آتا ہے
اس جماعت میں اصغر ۔ جگر ۔ فانی ۔ عزیز ۔ یاس ۔ رفیع ۔
رواں ۔ سیماب کے نام خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں اور میرا
اعتقاد ہے کہ ان اصحاب کو ہم بڑے فخر کے ساتھ متمدن ممالک کے
اعلیٰ سے اعلیٰ ادیبوں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں ۔

۱۰ اب میں صرف چند جملے عرض کر کے اپنے طویل مضمون کو ختم کرتا

ہوں۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ اگر موقع اور وقت مساعدت کرے تو وہ ہندی کے ادب سے واقف ہونے کی ضرور کوشش کریں۔ اس سے اُن کو ادب کے بیش بہا خزانوں سے آگاہ ہونے اور نیز اپنے ہموطنوں کی تہذیب سے روشناس ہونے کا موقعہ ملے گا۔ اسی کے ساتھ میں اپنے ہندو دوستوں سے گذارش کروں گا کہ اُردو کو اپنی چیز اور ہندوستان کی مشترکہ زبان سمجھ کر اُن کو اُس کی خدمت اور ترقی کی مساعی میں سرگرم رہنا چاہیئے۔ تاکہ کسی کو اُن پر یہ اعتراض کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔

اب میل وہ ہندو و مسلمان میں کہاں　　اغیار اُن پر کرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی کبھی بحث　　ہے سخت مضر نسخۂ گاؤ زباں

نیاز کیش
مینکش بدایونی
۱۹۴۶ء

قطعات

قطعہ

اے دوست تمھیں ہو مبارک بہارِ عید
دم سے تمھارے خلق میں ہو اعتبارِ عید
میکش کو دینے آئے ہو کیا عید کا پیام
شاہد خدا ہے میں تو ہوں اک سوگوارِ عید

قطعات

کہاں ملیگا

او بیکسِ وحشی کا پتہ پوچھنے والے
کیا جانئے وہ کس حالِ پریشاں میں ملیگا
یہ جھوٹ کہ وہ تازہ گرفتارِ محبت
پابندِ ستم گوشۂ زنداں میں ملے گا
یہ جھوٹ کہ وہ کوہ کن و قیس کا ثانی
آوارہ کسی کوہ و بیاباں میں ملیگا

یہ جھوٹ کہ وہ عارضِ گلگوں کا ہوا خواہ
گشتِ چمن و سیرِ گلستاں میں ملے گا
یہ جھوٹ کہ جب جھوم کے آئینگی گھٹائیں
وہ جام بلب محفلِ رنداں میں ملے گا
ہاں سچ ہے کہ وہ گردشِ قسمت کے اثر سے
اب وہ غم و حسرت و حرماں میں ملے گا
گنجینۂ غم سینۂ محزوں میں چھپائے
وہ مُہر بلب کلبۂ احزاں میں ملے گا

بیست و یکمی

یکمی آمد بهم

بیچه و نشست بسیار آمد

بیچه نفس صحبت وبال بیاید

سر به سر کرد تا بیاید

زنشانک گذشته سر کرد تا بیاید

سر بی فراق و کرد وبال بیاید

سر بی فراق سر کرد تا بیاید

سر بی دل سر کرد تا بیاید

سر بی سال بیاید

نه سیاه ای دوری و صحبت کرد آمد

بیچه ها کرد و جمال آمد

شیشه بی می میخانه ویران محفل رندان خراب
ای زدوده نقش رنگی از آن این شیوه نابود
محفل ساقی ایجاد بی جواب
ای که از نقش یکی سال ایجاد پیش کرده

آ کہ تیرے بغیر مے کش زار

کشمکش ہائے اضطراب میں ہے

بزمِ میخانہ ہے اداس اداس

جانِ ہر رند کی عذاب میں ہے

تیرے ہاتھوں سے جب نہ جام ملے

زہر میرے لئے شراب میں ہے

یہ جو ہے سب کا ورد یا ارنی
اب کہاں کون ترسیا ارنی

اس قیامت پر جس نے دیکھی ہے
اب کہاں سے کون با ارنی

بجز نیکی کیا سونپ کر جاتے ہیں گھر سے ہم
یہ ساری عمر کی الفت کے رشتے قطع کر جاتے ہیں

یہ مطلب ہے کہ ہم کو بھیجئے مطلب نہیں ورنہ
یہاں سے دور اس کوچہ کی گلیوں سے ہم گزر جاتے ہیں

آنکھیں مجھے دی ہیں کہ ترے نظارے کو

زینت ہے ازرق و بادا ابہوی جانی ہے

یہ بیت میں ادائی کی فراوانی ہے

ہر ایک سانس میں یہ ابھری جانی ہے

کبھی گزرتے دیوانے گذر گلشن میں سیر کرتے ہیں

تو یہاں بیچ غنچے پا سینے سے گذرتے ہیں

کیوں خوف آئے سنبل سے تری آنکھوں کی یادوں کو

یہیں کالا ایک جب سا پنجے پری سے ڈرتے ہیں

پیچ پیچ زلفوں کو چھوڑ کر وہ شوخ
مالک سے پیار ام ہوتا ہے

صبح بلبل کی آہ میں ہو سر
بے زنجیر سے امر ہوتا ہے

رنگ سحری ہے نئی گردشِ دوراں پیدا
دیکھیے دیکھیے ہو جاتے ہیں ساماں پیدا
اس شان ارسطوؤں نے دکھایا ہے سیاست
خانۂ مصور میں ہے نیا طوفاں پیدا

ستانے دو بیجا نہیں کچھ بھی اے دل

کسی کو عربدہ باطل کا اعتبار نہیں

اجل کی راہ اگر دیکھنا ہے دیکھ

سحر قریب ہے اب آس کا انتظار نہیں

آجاؤ اب فراق کا یارا نہیں رہا
بیکس کی زندگی کا سہارا نہیں رہا

ایسے میں ہے رفیق الم اب تمہاری یاد
سرشک سے حال ہمارا نہیں رہا

رباعیات

رُباعی

للہ مجھے بادۂ اطہر دینا
انگورِ مدینہ کی مقطر دینا
میکش جب اُٹھیں حشر میں مستانہ اُٹھے
ساقی وہ مئے حُبِ پیمبر دینا

جب مجھ میں نہ ہوں ولولے زندگانی دے
جاں آ گئی اب لبوں پہ پیاسی دے
گر جانے لگا ہوں سے جہانِ فانی
ساقی مجھ کو شرابِ باقی دے

ہم کو یہی جہانِ رنگ و بو بس ہے مرے لئے
آرائشِ بزمِ آرزو بس ہے مرے لئے

ہے سوئے ادب وگرنہ یہ کہہ دیتا
با ایں ہمہ بے نیازیِ او بس ہے مرے لئے

پھر دل میں ترقی کی لگن پیدا کر
ٹوٹی ہوئی کلیوں سے چمن پیدا کر

احساس خودی کی آزمائش کے لئے
پھر معرکۂ دار و رسن پیدا کر

(رشید)

ہنستی ہے اجل پہ بخت جاں میری

نازاں ہے الم پہ زندگانی میری

موجوں سے تلاطم کا نہیں ہے وسواس

پروردۂ طوفاں ہے جوانی میری

مجموعه‌ای از صد ادب طبع آورده‌ام
باب ساز طرب بی‌نوایان نوازم

چراغ بس بنگیرد ون نسیم بنیان
چه باس بس صد هزار شعر نایم

ہر نقش گرِ بزم مرے گھر کا آب و گل
ہیں تاب و تبِ شعلۂ شمعِ محفل
تجھ سے مری ہستی کا ستارہ روشن
تجھ سے مری دنیا کی تجلی حاصل

ہے موت سے تلخ زندگانی میری
افسانۂ ناتمام ہے کہانی میری
کمہلا نہ گئی ہوئے سپیدے سے دھوکا
ہے عمر میں سپید پن جوانی میری

سوزِ غمِ پنہاں کو دبا لیتا ہوں
خلوت میں کبھی اشک بہا لیتا ہوں

جب آہ لبوں تک آ ہی جاتی ہے کبھی
اشعار کے پردے میں چھپا لیتا ہوں

یہ آہ و فغاں کا شغل پیہم کب تک
یہ قلب و جگر و چشم پُرنم کب تک
اٹھ زندگیِ نو کی بنا ڈال اکبر
گزری ہوئی عشرتوں کا ماتم کب تک

سرمہ سا کہ نگہ کار زمانے میں نہیں
رہ چکا ہے تو وہ شیشۂ پیمانے میں نہیں

لالہ ہے باغ جری کو تشنگی کا یاس
وہ کہ گوہر ہے تیرے خزانے میں نہیں

دل سے نہ خال و زلف دلدار کی چاہ

ہے دانہ و دام راہ ابرار سے گمراہ

شیطان سے کی ہے کیا نفس کی تدبیر

لا حول و لا قوۃ الا باللہ

یہ عیش و نشاطِ زندگانی کب تک
یہ وصل و فراق کی کہانی کب تک

دنیا کے مزے یہ سب جوانی تک ہیں
لیکن یہ بتا سزا جوانی کب تک

آلام سے تکمیلِ وفا ہوتی ہے
اور آئینۂ دل کی جلا ہوتی ہے
آلام کے صدقے میں نگاہِ انساں
اسرارِ خودی سے آشنا ہوتی ہے

دو شعر

ابھی راہوں سے نامانوس دل ہے
قدم میں استقامت ہو کہاں سے
خمار آلود آنکھیں ہیں ابھی تک
ابھی جاگا ہوں اک خوابِ گراں سے

ملنے کا پتہ

فرینڈس بک ہاؤس
رسل گنج علی گڑھ

باہتمام خانصاحب جواہر خاں
مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپی

Date	No.	Date	No.

Maulana Azad Library

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of **Re. 1-00** per volume per day shall be charged for text-books and **10 Paise** per volume per day for general books kept over - due.